

بہنا پاتا تھا۔ اور سٹو کو پیار کرتی تھی اور اس پر بھروسہ رکھتی تھی۔ وہی سٹو آج اس سے  
 بسواس گھات کر رہی ہے۔ ممتھرا اور سٹو میں ضرور ہی پہلے سے تعلق رہا ہوگا۔ ممتھرا  
 اس سے ندی کنارے یا کھیتوں میں ملتا ہوگا اور آج وہ اتنی رات گئے ندی پار  
 کر کے اسی لئے یہاں آئی ہے۔ اگر اس نے ان دونوں کی باتیں نہ سن لی ہوتیں  
 تو اسے خبر تک نہ ہوتی۔ ممتھرا نے عشقیہ ملاقات کے لئے یہی موقع سب سے  
 زیادہ مناسب سمجھا ہوگا۔ گھر میں سناٹا جو ہے! اس کا دل سب کچھ جاننے کے لئے  
 بے چین ہو رہا تھا وہ سارا بھید جان لینا چاہتی تھی تاکہ اپنے بچاؤ کی کوئی تدبیر  
 سوچ سکے۔ اور یہ ممتھرا یہاں کیوں کھڑا ہے؟ کیا وہ اسے کچھ بولنے بھی دیگا۔  
 اس نے غصے سے کہا: ”تم باہر کیوں نہیں جاتے، آیا یہیں پیرا دیتے رہو  
 ممتھرا کچھ بولے بغیر باہر چلا گیا۔ اس کا خون خشک ہو رہا تھا کہ کہیں سٹو  
 سب کچھ کہہ نہ ڈالے۔ اور سٹو کی جان سوکھ رہی تھی کہ اب وہ لٹکتی ہوئی تلوار  
 سر پر گرا ہی چاہتی ہے۔“

تب سونا نے بڑی خفگی سے پوچھا: ”دیکھو سٹو! سب ٹھیک ٹھیک بناؤ  
 نہیں میں تمہارے سامنے یہیں اپنی گردن پر گنڈا سا مار لوں گی، پھر تم میری  
 سوت بن کر راج کرنا۔ دیکھو گنڈا سا وہ سامنے پڑا ہے۔ دو تلواریں ایک میان  
 میں نہیں رہ سکتیں۔“

- اس نے لپک کر گنڈا سا اٹھالیا اور اسے ہاتھ میں لے کر پھر بولی: ”یہ  
 مت سمجھنا کہ میں نرمی دھکی دے رہی ہوں۔ اس میں کیا کر بیٹھوں، نہیں کہہ  
 سکتی ٹھیک ٹھیک بنا دو۔“

سلیا کانپ اٹھی۔ اس کے منہ سے ایک ایک لفظ اس طرح نکل پڑا  
 جیسے گراموفون میں بھری ہوئی آواز ہو۔ وہ ایک بات بھی نہ چھپا سکی۔ سونا کے

چہرے سے خوفناک ارادہ ظاہر ہو رہا تھا گویا اس پر خون سوار ہو۔  
 سونانے اس کی طرف برہمی سی چبھ جانے والی نگاہوں سے دیکھا  
 اور کٹار سے جھوٹ کرتی ہوئی سی بولی: "ٹھیک ٹھیک کہتی ہو؟"  
 بالکل ٹھیک۔ اپنے بچے کی سوگند"  
 کچھ چھپایا تو نہیں؟

اگر میں نے رتی بھر بھی چھپایا ہو تو میری آنکھیں پھوٹ جائیں۔  
 "تو نے اس پانی کو لات کیوں ماری؟ اسے دانت سے کاٹ کیوں نہیں  
 لیا؟ اس کا لہو کیوں نہ پی لیا۔ تو چلائی کیوں نہیں؟"  
 سنا کر جواب دے؟

سونانے پاگل کی طرح انکاروں کی سی آنکھیں نکال کر کہا: بولتی کیوں  
 نہیں؟ کیوں تو نے اس کی ناک دانٹوں سے نہیں کاٹ لی؟ کیوں نہیں دونوں  
 ہاتھوں سے اس کا گلا دبا یا؟ تب میں تیرے چرنوں پر سر جھکاؤں۔ اب تو تو میری  
 آنکھوں میں ہر جاتی ہے، پوری بیسوا! اگر یہی کرنا تھا تو دانتوں کے نام کو کیوں  
 کلنک لگا رہی ہے؟ کیوں کسی کو لے کر بیٹھ نہیں جاتی؟ کیوں اپنے گھر نہیں چلی  
 گئی؟ یہی تو تیرے گھر واسے چاہتے تھے، تو اپنے اور گھاس لے کر ہٹ جاتی  
 وہاں سے پیسے لاتی اور تیرا باپ بیٹھا ہوا اس پیسے کی تارڑی پٹا۔ پھر کیوں  
 اس کی آبرو میں بٹہ لگایا؟ کیوں ستونتی بنی بیٹھی ہے؟ جب اکیلے نہیں رہا جانا  
 تو کیوں کسی سے سگائی نہیں کر لیتی؟ کیوں ندی تالاب میں ڈوب نہیں مرنی۔  
 کیوں دوسروں کی جندگی میں بس گھولتی ہے۔ آج میں تجھ سے کہہ دیتی ہوں  
 کہ اگر اس طرح کی بات پھر کبھی ہوئی اور مجھے پتہ چلا تو ہم بنوں میں سے ایک  
 بھی جیتا نہ رہے گا۔ بس اب منہ میں کا لکھ لگا کر چل دے۔ آج سے میرے

اور تیرے بیچ میں کوئی ناتانہیں ہے۔“

سکو چپکے سے اٹھی اور سنبھل کر کھڑی ہوئی معلوم ہوا کہ اس کی مکر ٹوٹ گئی ہے۔  
ایک لمحہ تک ہمت کی فراہمی کی کوشش کرتی رہی مگر اپنی صفائی میں کچھ سمجھ نہ پڑا۔  
آنکھوں میں اندھیرا تھا، سر میں چکر، گلا سوکھ رہا تھا اور سارا بدن بے حس تھا، جیسو  
مسافات سے جان نکل رہی ہو۔ ایک ایک قدم اس طرح رکھتی ہوئی جیسے سامنے  
کوئی گرہ تھا ہو۔ وہ باہر آئی اور ندی کی طرف چلی۔

دروازے پر متھرا کھڑا تھا۔ بولا: ”اس بھکت (وقت) کہاں جاتی ہو سکو“  
سکو نے کچھ جواب نہ دیا۔ متھرا نے بھی پھر کچھ نہ پوچھا۔

وہی رو پہلی چاندنی اب بھی چھائی ہوئی تھی۔ ندی کی لہریں اب بھی چاندنی  
میں نہا رہی تھیں اور سکو دیوانگی کی سی حالت میں خواب کے سائے کی طرح  
نری میں چلی جا رہی تھی۔

مزدوروں کی ہڑتال جاری ہے مگر اب اس سے مل کے مالکوں کا کوئی خاص نقصان نہیں ہے۔ نئے آدمی کم اجرت پر مل گئے ہیں اور جان توڑ کر کام کرتے ہیں۔ کیونکہ ان میں سب ہی ایسے ہیں جو بیکاری کی تکلیفیں اٹھا چکے ہیں اور اب اپنی سکت بھر کوئی ایسا کام نہیں کرنا چاہتے جس سے رزق میں خلل پڑے۔ چاہے جتنا کام لو اور چاہے جتنی جھپٹیاں دو، انھیں کوئی شکایت نہیں۔ سر جھکاتے ہوئے بیلوں کی طرح کام میں لگے رہے ہیں، گھڑکیوں، گھائیوں، یہاں تک کہ ڈنڈوں کی مار سے بھی انھیں کوئی شکایت نہیں ہوتی، اور اب پرانے مزدوروں کے لئے اس کے سوا اور کوئی راستہ نہیں، رہ گیا ہے کہ وہ اس گھٹی ہوئی مزدوری پر کام کرنے آئیں۔ اور کھانا صاحب کی خوشامد کریں۔ پنڈت اور کارناٹھ تو انھیں ذرا بھی اعتبار نہیں ہے۔ انھیں اب وہ تنہا پائیں تو شاید بری طرح خبر لیں۔ مگر پنڈت جی بہت بچے ہوئے رہتے ہیں۔ چراغ جلنے کے بعد اپنے دفتر سے اہر نہیں نکلتے اور افسروں کی خوشامد میں بھی لگے رہتے ہیں۔ مرزا خورشید کی دھماک اب بھی جیوں کی تولا ہے۔ لیکن مرزا ان غریبوں کی تکلیف اور اس کے دور کرنے کی کوئی سبیل نہ دیکھ کر دل سے چاہتے ہیں کہ سب کے سب بحال کر لئے جائیں، مگر اس کے ساتھ ہی نئے آدمیوں کی تکلیف کا خیال کر کے پوچھنے والوں سے یہی کہہ رہے ہیں کہ جیسی مرضی ہو دیا کریں۔

سٹر کھانے پرانے آدمیوں کو بھرنو کری کرنے کا خواہش مند دیکھا تو

اور بھی اکر گئے، حالانکہ وہ خوب جانتے تھے کہ اس اجرت پر پرانے آدمی سنے  
لوگوں سے کہیں بہتر ہیں۔ پرانے آدمیوں میں زیادہ تر بچپن ہی سے مل میں کام  
کرنے کے عادی تھے اور خوب مشتاق تھے۔ نئے آدمیوں میں زیادہ تر دیہاتوں  
کے دکھی کسان جنہیں کھلی ہوا اور میدان میں پرانے زمانے کے چوبی اوزاروں  
سے کام کرنے کی عادت تھی۔ مل کے اندر ان کا دم گھٹتا تھا اور مشینری کے  
نیز چلنے والے پرزوں سے انہیں ڈر لگتا تھا۔ آخر جب پرانے آدمی خوب  
پست ہو گئے تب کھتا انہیں بحال کرنے پر راضی ہوئے مگر نئے آدمی اس  
سے کم اجرت پر کام کرنے کو تیار تھے اور اب ڈائرکٹروں کے سامنے یہ سوال  
تھا کہ وہ پرانے لوگوں کو بحال کریں یا نئے آدمیوں کو ہی رہنے دیں۔ ڈائرکٹر  
میں نصف تو نئے آدمیوں کی اجرت گھٹا کر رکھنے کے حق میں تھے اور بقیہ  
نصف کی یہ رائے تھی کہ پرانے ہی آدمیوں کو موجودہ اجرت پر رکھ لیا جائے  
کچھ روپے زیادہ خرچ ہوں گے مزدور، مگر کام اب سے کہیں زیادہ ہوگا کھتا  
مل کی روح رواں تھے اور ڈائرکٹر تو ان کے ہاتھ کی کٹھ پتلیاں تھے۔ فیصلہ  
کھنا ہی کے ہاں میں تھا اور وہ اپنے دوستوں ہی سے نہیں بلکہ دشمنوں سے  
بھی اس بارے میں رائے لے رہے تھے۔ سب سے پہلے تو انہوں نے  
گو بندی کی رائے لی۔ جب سے مالتی کی طرف سے انہیں بالوسی ہو گئی تھی  
اور گو بندی کو معلوم ہو گیا تھا کہ جتنا جیسا عالم، تجربہ کار اور دانا شخص میری کتنی  
عزت کرتا ہے اور مجھ سے کسی قسم کی ریاضت کی امید رکھتا ہے، تب سے  
زن و شوہر میں پھر محبت پیدا ہو گئی تھی۔ محبت نہ سہی تو باہمی ربط و ضبط تو تھا ہی  
آپس میں وہ ملن اور بچپنی نہ تھی۔ درمیانی دیوار ٹوٹ گئی تھی۔  
مالتی کے رنگ دھنگ کی بھی کایا پلٹ ہو رہی تھی۔ مہتا کی زندگی اب تک

اب تک مطالعہ اور غور و خوض میں گزری تھی۔ سب کچھ پڑھ چکے اور دینداری و کفر کو خوب پرکھ لینے کے بعد وہ اسی نتیجہ پر پہنچے تھے کہ تعلق و بے تعلقی دونوں کے بیچ کا جو خدمتی راستہ ہو وہی زندگی کو با معنی، اور ہستی کو بلند و پاکیزہ بنا سکتا ہے۔ کسی ہمہ دان خدا پران کا اعتقاد نہ تھا۔ اگرچہ وہ اپنی دہریت کو ظاہر نہ کرتے تھے، اس لئے کہ اس کے متعلق قطعی طور سے کوئی رائے قائم کرنا وہ اپنے لئے ناممکن سمجھتے تھے، مگر یہ خیال ان کے دل میں مضبوطی سے قائم ہو گیا تھا کہ جانداروں کی پیدائش و موت اور ان کے تکلیف و آرام یا عذاب و ثواب کے متعلق کوئی خدائی قانون نہیں ہے۔ ان کا خیال تھا کہ انسان نے اپنی خود ہی میں اپنے کو اتنا عظیم بنالیا ہے کہ اسے ہر ایک کام کی تحریک خدا ہی سے ملا کرتی ہے۔ اسی طرح وہ مڈیاں بھی خدا کو ذمہ دار ٹھہراتی ہوں گی، جو اپنی راہ میں سمندر کے مائل ہو جانے پر اربوں کی تعداد میں مرجاتی ہیں اگر خدائی قوانین اتنے ناقابل فہم ہیں کہ انسان کی سمجھ میں نہیں آتے تو انھیں ماننے ہی سے انسان کو ڈھارس مل سکتی ہے؟ خدائی تصور کا ایک ہی مقصد ان کی سمجھ میں آتا تھا اور وہ تھا انسانی زندگی کا ایک ہونا۔ وحدت یا کثرت یا عدم نشو و نما کو روحانی نہیں، بلکہ مادی نقطہ خیال سے دیکھتے تھے۔ اگرچہ ان باتوں کا کسی تاریخی زمانے میں بھی بول بالا نہیں رہا، پھر بھی بنی نوع انسان کے جبلی ارتقاء میں ان کا درجہ بڑی اہمیت کا ہے۔ انسانوں کی یکسانیت میں بہتہ کا بہت بڑا اعتقاد تھا مگر اس اعتقاد کے لئے انھیں خدائی وجود کے تسلیم کرنے کی ضرورت نہ معلوم ہوتی تھی۔ ان کی انسانی محبت کا انحصار اس پر نہ تھا کہ جملہ جانداروں میں ایک روح ہے۔ توحید و شرک کا مسئلہ ان کی نظر میں رواجی اہمیت کے سوا کوئی اور اہمیت نہ رکھتا تھا اور وہ استعمالی اہمیت ان کے نزدیک انسانوں

کو ایک دوسرے کے قریب لائے، ان کی باہمی تفریق کے مٹانے اور ان میں  
 اخوت کا جذبہ پیدا کرنے ہی میں مضمر تھی۔ یہ یکسانیت ان کے دل میں کچھ ایسی  
 قائم ہو گئی تھی کہ اس کے لئے کسی روحانی بنیاد کا پیدا کرنا ان کی نظر میں بالکل  
 فضول تھا۔ پھر ایک بار اس اصیلت کو جان کر وہ خاموش نہ بیٹھ سکتے تھے۔ بے پٹی  
 کے ساتھ بلا کسی ذاتی غرض کے زیادہ سے زیادہ کام کرنا ان کے لئے ضروری ہو گیا  
 تھا۔ جس کے بغیر ان کے دل کو سکون نہ مل سکتا تھا۔ شہرت، منفعت یا فرض کی  
 ادائیگی کے خیالات ان کے دل میں آتے ہی نہ تھے۔ ان کی بے ماگی ہی انھیں  
 ان سے بچانے کے لئے کافی تھی۔ خدمت ہی اب ان کی خاص غرض ہوتی  
 جاتی تھی اور ان کی اس فراخ دلی کا اثر درپردہ مانتی پر بھی پڑتا جاتا تھا۔ اب  
 تک جتنے مرد اسے ملے سب نے اس کی عیاں شائے رغبت ہی کو اکسایا۔ اس  
 کے ترک و انشاک کی طاقت روز بروز گھٹتی ہی تھی مگر مہنتا کی صحبت سے اس پر  
 تازگی آنے لگی۔ سب ہی حقیقی انسانوں میں یہ جذبہ چھپا رہتا ہے۔ اور روشنی  
 پا کر جھک اٹھتا ہے۔ انسان اگر دولت یا شہرت کے پیچھے پڑا ہے تو سمجھ لو  
 کہ ابھی تک وہ کسی اہل دل کے لگاؤ میں نہیں آیا۔ مانتی اب اکثر غریبوں کے  
 گھر بلائیں لئے مریضوں کو دیکھنے چلی جاتی تھی اور مریضوں کے ساتھ اس کے  
 برتاؤ میں بڑی نرمی آگئی تھی۔ ہاں ابھی تک وہ بناؤ سنگار سے اپنا دل نہ ہٹا سکی  
 تھی۔ رنگ اور پادوؤں کا چھوڑنا اسے اپنی باطنی تبدیلیوں سے بھی کہیں زیادہ  
 مشکل معلوم ہوتا تھا۔

ادھر کبھی کبھی وہ دونوں دیہاتوں کی طرف چلے جاتے تھے اور کسانوں  
 کے ساتھ دو چار گھنٹے رہ کر اور کبھی کبھی ان کے جھونپڑوں میں رات کاٹ کر ادھر  
 ان ہی کا سا کھانا کھا کر اپنے کو خوش قسمت سمجھتے تھے۔ ایک روز وہ سمری پہنچ،

گئے اور گھومتے ہوئے بیلاری بھی جا پہنچے۔ ہوری دروازے پر بیٹھا چلم بی رہا تھا کہ مانتی اور مہتا آکر کھڑے ہو گئے۔ مہتا نے ہوری کو دیکھتے ہی پہچان لیا اور بولا: ”یہی تھا جاگائوں ہے؟ یاد ہے جب ہم لوگ رائے صاحب کے یہاں آئے تھے اور تم دھنش گیس میں مالی بنے تھے؟“  
ہوری کی یاد تازہ ہو گئی پہچان گیا اور ٹپٹوری کے گھر کی طرف کر رہا لانے چلا۔

مہتا نے کہا: ”کریوں کا کوئی کام نہیں۔ ہم لوگ اسی چارپائی پر بیٹھ جاتے ہیں۔ یہاں کرسی پر بیٹھ نہیں۔ تم سے کچھ سیکھنے آئے ہیں۔“  
دونوں چارپائی پر بیٹھ گئے۔ ہوری متحیر کھڑا رہا۔ ان لوگوں کی کسا خاطر کرے؟ بڑے آدمی ہیں۔ ان کی خاطر کرنے لائق اس کے پاس ہے کیا آخر اس نے پوچھا: ”پانی لاؤں؟“  
مہتا نے کہا: ”ہاں پیاس تو لگی ہے۔“  
”کچھ مٹھائی بھی لیتا آؤں؟“  
”لاؤ، اگر گھر میں ہو۔“

ہوری گھر میں مٹھائی اور پانی لانے گیا تب تک گائوں کے لڑکوں نے آکر ان دونوں کو گھیر لیا اور دیکھنے لگے گویا عجائب خانے سے دو نئے نمونے آگئے ہوں۔

سلیا بچے کو لئے کسی کام سے چلی جا رہی تھی ان دونوں کو دیکھ کر تعجب سے ٹھہر گئی۔

مانتی نے آکر اس کے بچے کو گود میں لے لیا اور پیار کرتی ہوئی بولی نکتے دنوں کا ہے؟“

سلیا کو ٹھیک نہ معلوم تھا۔ ایک دوسری عورت نے بتلایا: کوئی سال  
بھر کا ہوگا؟

سلیا نے تائید کی۔

مالتی نے مذاق کیا: پیارا بچہ ہے، اسے ہمیں دے دو۔  
سلیا نے گھمنڈ سے پھول کر کہا: آپ ہی کا تو ہے۔

”تو میں اسے لے جاؤں۔“

”لے جائیے آپ کے ساتھ رہ کر آدمی ہو جائے گا۔“

”گاؤں کی دوسری عورتیں آگئیں اور مالتی کو ہواری کے مکان میں لے  
گئیں کیونکہ یہاں مردوں کے سامنے مالتی سے گفتگو کرنے کا موقع انہیں نہ  
ملا۔ مالتی نے دیکھا کہ چار پائی بھی ہے اور اس پر ایک درمی پڑی ہوئی ہے  
جو پیشوری کے یہاں سے مانگ کر لائی گئی تھی۔ مالتی جا کر بیٹھی۔ بچوں کی حفاظت  
اور پرورش کی بات چلی۔ عورتیں جی لگا کر منی ہیں۔

دھیانسنے کہا: یہاں سب کام کیسے ہوگا، سرکار! کھانے تک کا  
ٹھکانا تو ہے نہیں۔“

مالتی نے تجھایا: ”صفائی میں کچھ خرچ نہیں، صرف تھوڑی سی محنت

اور ہوشیاری سے کام چل سکتا ہے۔“

دلاری نے پوچھا: یہ سب باتیں آپ کو کیسے معلوم ہوئیں سرکار؟ آپ کا

توا بھی بیاہ نہیں ہوا۔“

مالتی نے مسکرا کر پوچھا: ”تہیں کیسے معلوم ہوا کہ میرا بیاہ نہیں ہوا؟“

سب ہی عورتیں منہ پھر کر مسکرائیں۔ ”پنیا بولی۔“ بھلا یہ بھی چھپا رہا ہے

سرکار! منہ دیکھتے ہی پتہ چل جاتا ہے۔“

ماتنی نے جھینپتے ہوئے کہا: "اسی لئے بیاہ نہیں کیا کہ آپ لوگوں کی خدمت کیسے کرنی؟"

سب نے ایک زبان سے کہا: "دھن ہو سرکار! دھن ہوا!"  
 سلیا ماتنی کے پیر دبانے لگی: "سرکار! کتنی دور سے آئی ہیں، تھک گئی ہوں گی۔"

ماتنی نے پیر کھینچ کر کہا: "نہیں نہیں، میں تھکی نہیں ہوں۔ میں تو موٹر پر آئی ہوں۔ میں چاہتی ہوں کہ آپ لوگ اپنے بچے لائیں تو میں انہیں دیکھ کر بناؤں کہ آپ انہیں کس طرح نند رست رکھ سکتی ہیں۔"

ذرا دیر میں میں پچیس بچے آگئے۔ ماتنی انہیں دیکھنے لگی۔ کئی بچوں کی آنکھیں اٹھی تھیں ان کی آنکھوں میں دوا ڈالی۔ زیادہ تر بچے کمزور تھے جس کا سبب تھا والدین کو اچھا کھانا نہ ملنا۔ ماتنی کو یہ جان کر تعجب ہوا کہ دوڑ بہت کم گھروں میں ہوتا ہے اور گھی کے نورسوں درشن نہ ہوتے تھے۔

ماتنی نے یہاں بھی انہیں کھانے کی اہمیت بتائی جیسا وہ سب ہی گانوں میں بتایا کرتی تھی اس کا جی اس لئے کڑھتا تھا کہ یہ لوگ اچھا کھانا کیوں نہیں کھاتے۔ اسے دیہاتوں پر غصہ آ جاتا تھا۔ کیا تمہارا جنم اسی لئے ہوا ہے کہ تم مر مر کر مائاؤ اور جو کچھ پیدا ہوا اسے کھانے کو؟ جہاں دو چار سیلوں کے لئے چار اسے وہاں دو ایک گائے بھینسوں کے لئے چار انہیں ہے؟ کیوں یہ لوگ غذا کو زندگی کی خاص چیز نہ سمجھ کر اسے صرف جان بچانے کی چیز سمجھتے ہیں۔ کیوں سرکار سے نہیں کہتے کہ برائے نام سود پر روپیہ کر انہیں سود خور مہا جنوں کے پنجے سے بچائے۔ اس نے جس کسی سے پوچھا تو یہی معلوم ہوا کہ اس کی کمائی کا بڑا حصہ مہا جنوں کا قرض ادا کرنے میں صرف ہو جاتا ہے۔

بٹوارے کا مرض بھی بڑھتا جاتا ہے۔ آپس میں اتنی مغائرت تھی کہ شاید ہی کوئی دو  
 بھائی ایک ساتھ رہتے ہوں۔ ان کی اس درگت کا سبب بہت کچھ ان کی تنگ  
 خیالی اور خود غرضی تھی۔ الٹی یہی باتیں عورتوں سے کرتی رہی، ان کی عقیدت  
 دیکھ کر اس کے دل میں خدمت کی تحریک اور بھی زور پکڑ رہی تھی۔ اس قربانی کی  
 زندگی کے سامنے وہ عیش و آرام کی زندگی کتنی حقیر اور مصنوعی تھی۔ آج اس کے  
 وہ ریشمی کپڑے جن پر زری کا کام تھا، اور وہ خوشبو سے ہسکتا ہوا بدن اور وہ پاؤں  
 لگا ہوا چہرہ اسے شرمندہ کرنے لگا۔ اس کی کلائی پر بندھی ہوئی سونے کی گھڑی  
 جیسے ٹکٹی لگائے اسے گھور رہی تھی۔ اس کے گلے میں چمکتا ہوا جڑاؤ نکلس جیسے  
 اس کا گلا گھونٹ رہا تھا۔ ان تیاگ اور بھگتی کی دیویوں کے سامنے وہ اپنی ہی نظر  
 میں حقیر ہو رہی تھی۔ وہ ان دیہاتوں سے بہت سی باتیں زیادہ جانتی تھی، دفنی  
 رفتار سے زیادہ واقف تھی۔ لیکن جن حالات میں یہ غریب عورتیں اپنی زندگی کو کارآمد  
 بنا رہی ہیں ان میں کیا وہ ایک دن بھی رہ سکتی ہے؟ دل میں غور کا نام بھی نہیں  
 دن بھر کام کرتی ہیں، فاقہ کرتی ہیں، روتی ہیں، پھر بھی اتنی ہنس کھ اور زندہ دل  
 ہیں! بیگانے ان کے لئے اس قدر بیگانے ہو گئے ہیں کہ ان کا اپنا وجود ہی  
 نہیں رہا۔ ان کی بیگانگت اپنے بچوں میں، اپنے شوہر میں اور اپنے رشتہ داروں  
 میں ہے۔ اسی خیال کی حفاظت کرتے ہوئے اور اسی کے دائرے کو بڑھاتے  
 ہوئے مستقبل کا ناسائی معیار بنے گا۔ بیدار عورتوں میں اس کے بجائے خود پروری  
 کا جو خیال پیدا ہو گیا ہے، یعنی سب کچھ اپنے لئے، اپنے ہی عیش و آرام کے  
 لئے، اس سے تو یہ خواب کی حالت ہی بھلی! مانا کہ مرد بے رحم ہے مگر ہے تو  
 ان ہی ماؤں کا جایا ہوا کیوں ماں نے روتے کیوں تعلیم نہیں دی کہ وہ ماں کی اور  
 اس کے ماتے کل نسوانی طبقہ کی پرستش کرنا؟ اسی لئے کہ ماں کو دینی تعلیم دینا

نہیں آتا، اسی لئے کہ اس نے خود کو اتنا مٹا دیا ہے کہ اس کی ہیئت ہی تبدیل ہو گئی ہے، اس کی شخصیت ہی ختم ہو گئی ہے۔

انہیں خود کو مٹانے سے کام نہ چلے گا۔ عورت کو سماج کی فلاح کے لئے اپنے حقوق کی حفاظت کرنی ہوگی، اسی طرح بیسے ان کالوں کو اپنی حفاظت کے لئے اپنی اس فرشتہ خصلتی کو کسی قدر ترک کرنا پڑے گا۔

شام ہو گئی تھی۔ مانتی کو عورتیں اب تک گھیرے ہوئے تھیں۔ اس کی باتوں سے جیسے ان کا جی ہی نہ بھرتا تھا۔ کئی عورتوں نے ان سے رات میں یہیں رہنے کا اصرار کیا۔ مانتی کو بھی ان کا سادہ پریم ایسا پیارا لگا کہ اس نے ان کی دعوت منظور کر لی۔ رات کو عورتیں اسے اپنا گانا سنائیں گی۔ مانتی نے گھر گھر میں جا کر ہر جگہ کی حالت سے واقفیت حاصل کرنے میں اپنا وقت صرف کیا۔ اس کی پُر خلوص خواہی اور ہمدردی دیہاتی عورتوں کے لئے دلہی کے بردان سے کم نہ تھی۔

ادھر مہتا صاحب چارپائی پر بیٹھ ہوئے کسانوں کی کشتی دیکھ رہے تھے بچتا رہے تھے کہ مرزا صاحب کو کیوں نہ ساتھ لے لیا، ورنہ ان کی بھی ایک کشتی ہو جاتی۔ انہیں تعجب ہو رہا تھا کہ ایسے مضبوط اور معصوم لڑکوں کے ساتھ تعلیم یافتہ لوگ نیکسے بے رحمی کا برتاؤ کرتے ہیں۔ نادانی کی طرح دانائی بھی سادا، صاف اور سنہرے پتلون والی ہوتی ہے انسانیت پر اس کا اتنا زبردست اعتماد ہوتا ہے کہ وہ مخالفانہ سلوک کو انسانیت کے خلاف سمجھنے لگتی ہے۔ وہ بھول جاتی ہے کہ بھڑیلوں نے بھڑیلوں کی مصیبت اور بے جا رگی کا جواب ہمیشہ پنچوں اور دانوں سے دیا ہے۔ وہ اپنی ایک معیاری دیتا بنا کر اسے معیاری شخصیتوں سے آباد کرتی ہے۔ اور اسی میں گمن رہتی ہے۔ حقیقت کتنی ناقابلِ شکل اور غیر قدرتی ہے۔ یہ خیال کرنا اس کے لئے مشکل ہو جاتا ہے۔ مہتا صاحب

اس وقت ان گنواروں کے رنج میں بیٹھے ہوئے اسی مسئلے کو حل کر رہے تھے کہ ان کی حالت انہی قابل رحم کیوں ہے۔ وہ اس سچائی سے سامنا کرنے کی ہمت نہ کر سکتے تھے کہ ان کی فرشتہ خصلتی ہی ان کی تباہ حالی کا سبب ہے۔ کاش یہ لوگ زیادہ انسان اور کم تر فرشتہ ہوتے تو اس طرح نہ ٹھکرائے جاتے۔ بلکہ میں کچھ بھی ہو، انقلاب ہی کیوں نہ آجائے مگر ان سے کوئی واسطہ نہیں۔ کوئی جماعت ان کے سامنے طاقت ور بن کر آئے تو اس کے سامنے یہ سر جھکانے کو تیار ہیں۔ ان کی معصومیت، بے حسی کسی مد تک پہنچ گئی ہے، جسے کوئی سخت صدر ہی ذی حص اور مخرک بنا سکتا ہو۔ ان کی آتما گویا ہر طرف سے مایوس ہو کر اب اپنے اندر ہی پیر نور کو بیٹھ گئی ہے، گویا ان میں زندگی کا احساس ہی نہیں ہو۔

شام ہو گئی تھی۔ جو لوگ اب تک کھیتوں میں کام کر رہے تھے۔ وہ بھی دوڑے چلے آئے تھے۔ اسی وقت مہتا نے مالتی کو گاؤں کی کئی عورتوں کے ساتھ ایسی محبت سے ایک بچے کو گود میں لئے دیکھا گویا وہ بھی ان ہی میں سے ایک ہو۔ مہتا کا دل خوشی سے بھر گیا۔ مالتی نے ایک طرح سے خود کو مہتا کے لئے وقف کر دیا تھا۔ اس کے متعلق مہتا کو اب کوئی شک و شبہ نہ تھا۔ مگر ابھی تک ان کے دل میں مالتی کے لئے وہ پاک اور بلند خواہش پیدا نہ ہوئی تھی جس کے بغیر شادی کی تجویز کرنا ان کے لئے مضحکہ انگیز تھا۔ مالتی ناخواندہ ہمارن کی طرح ان کے دروازے پر اکھڑی ہو گئی تھی اور مہتا نے اس کا خیر مقدم کیا تھا۔ اس میں محبت کا جذبہ نہ تھا، صرف مردیت کا جذبہ تھا۔ اگر مالتی انہیں اس قابل سمجھتی ہے کہ ان پر رعایت کی نظر کرے تو مہتا ان کی اس عنایت کو نا منظور نہ کر سکتے اس کے ساتھ ہی وہ مالتی کو گوبندی کے راستے سے مٹا دینا چاہتے تھے اور وہ جانتے تھے کہ مالتی جب تک اپنا پیر آگے نہ جمائے گی، پچھلا پیر نہ اٹھائے گی۔

وہ جانتے تھے کہ مانتی کے ساتھ فریب کر کے وہ کینگی ہی کا اظہار کر رہے ہیں۔ اس کے لئے ان کا ضمیر انھیں برا بھلا مت کرتا رہتا تھا، مگر جیوں جیوں وہ مانتی کو قریب سے دیکھتے تھے ان کے دل میں کشش بڑھتی جاتی تھی۔ جن کی دلکشی تو ان پر کوئی اثر نہ ڈال سکتی تھی۔ یہ اوصاف کی دلکشی تھی۔ وہ جانتے تھے کہ جسے سچی محبت کہہ سکتے ہیں۔ وہ ایک رشتے میں منسلک ہو جانے کے بعد ہی پیدا ہو سکتی ہے۔ اس کے قبل جو محبت ہوتی ہے۔ وہ تو محض فریفتگی ہے جسے ذرا بھی قیام و قرار نہیں۔ مگر اس سے پہلے یہ نصفینہ تو کر لینا ضروری تھا کہ جو محبت باہمی قربت کی خزاں پر چڑھے گا وہ خزاں کے لئے موزوں بھی ہے یا نہیں بھی پتھر تو خزاں پر چڑھ کر خوب صورت صورتوں کی شکل نہیں اختیار کر لیتے۔ اتنے دنوں میں مانتی نے ان کے دل کے مختلف حصوں پر اپنی شمعیں ڈالی تھیں۔ جو ابھی تک مرکوز ہو کر شعلے کی صورت میں نہ پھوٹ پڑی تھیں جس سے ان کا سارا دل روشن ہو جاتا۔ آج مانتی نے اپنی دیہانی بہنوں سے مل کر اور ساری تفریق کو مٹا کر گویا ان شعاعوں کو مرکوز کر دیا۔ اور آج پہلی بار مہتا کو مانتی کے متعلق جگانگت کا احساس ہوا۔ جیوں ہی مانتی گانوں کا گشت لگا کر ٹوٹی، انھوں نے اسے ساتھ لے کر ندی کی طرف رخ کیا رات یہیں گزارنے کا ارادہ ہو گیا۔ مانتی کا دل آج نہ جانے کیوں دھڑکنے لگا۔ مہتا کے چہرے پر آج اکو ایک عجیب روشنی اور خواہش جھلکتی ہوئی نظر آئی۔

ندی کے کنارے چاندی کا فرش بچھا ہوا تھا اور ندی جواہرات سے جڑے ہوئے گہنے پہنے ہوئے بیٹھے سروں میں گھاگھا کر چاند اور تاروں ما اور غودگی کی حالت میں سر جھکائے ہوئے پیڑوں کو اپنا رقص دکھا رہی تھی مہتا قدرت کی متوالی پھیں پر جیسے مست ہو گئے، گویا ان کا بچپن اپنے سارے

کھیلوں کے ساتھ لوٹ آیا ہو ریت پر کودتے اور دوڑتے ہوئے ندی میں جا کر گھٹنے تک پانی میں کھڑے ہو گئے۔

مالتی نے کہا: پانی میں نہ کھڑے ہو، کہیں ٹھنڈ نہ لگ جائے۔  
ہتھانے پانی اچھال کر کہا: میرا تو جی چاہتا ہے کہ تیر کر ندی کے اُس پار چلا جاؤں۔

”نہیں نہیں پانی سے نکل آؤ۔ میں نہ جانے دوں گی۔“  
”تم میرے ساتھ نہ چلو گی؟ اس سوئی بستی میں جہاں سپنوں کا راج ہے۔“

”مجھے تو تیرنا نہیں آتا۔“

”اچھا آؤ ایک ناؤ بنائیں اور اس پر بیٹھ کر چلیں۔“  
وہ باہر نکل آئے۔ اُس پاس بڑی دور تک جھاؤ کا جھلکھڑا تھا۔ ہتھانے نے جیب سے چاقو نکالا اور بہت سی ٹہنیاں کاٹ کر جمع کیں۔ کنارے پر سرپٹ اُگا ہوا تھا۔ وہاں جا کر ایک گھٹا کاٹ لائے اور وہیں بالو کے فرش پر بیٹھ کر سی بیٹنے لگے۔ ایسے خوش گویا بہشت جانے کی تیاری کر رہے ہوں۔ کئی بار اچھکیاں چرگئیں، خون نکلا۔ مالتی ناراض ہو رہی تھی اور بار بار گانوں میں جانے کے لئے اصرار کر رہی تھی مگر انھیں کوئی پروا نہ تھی۔ وہی بچوں کی سی خوشی تھی وہی الرطہ پن تھا، وہی ہٹ تھی۔ فلسفہ اور سائنس سب ہی اس بہاؤ میں بہہ گئے تھے۔

رتی تیار ہو گئی۔ جھاؤ کا بڑا تختہ سامن گیا۔ ٹہنیاں دونوں سروں پر رتی سے جوڑ دی گئی تھیں۔ اس کے سواخوں میں جھاؤ کی پتیاں بھر دی گئیں تاکہ پانی اوپر نہ آئے۔ ناؤ تیار ہو گئی۔ رات اور بھی خواب آور ہو گئی تھی۔

مہتا نے ناؤ کو پانی میں ڈال کر مالتی کا ہاتھ پکڑے ہوئے کہا: "آؤ بیٹھو مالتی نے ڈرتے ہوئے کہا: "دو آدمیوں کا بوجھ سہا رکھے گی!"

مہتا نے فلسفیانہ قبم سے کہا: "جس ناؤ پر بیٹھے ہوئے ہم لوگ زندگی کا سفر پورا کر رہے ہیں وہ تو اس سے کہیں زیادہ کمزور ہے مالتی! کیا ڈر ہی ہو؟"

"ڈر کس بات کا جب تم ساتھ ہو۔"

"سچ کہتی ہو۔"

"اب تک میں نے بلا کسی کی مدد کے مشکلوں کو سر کیا ہے۔ اب تو تمہارا ساتھ ہوں۔"

دونوں اس جھاؤ کے تختے پر بیٹھے اور مہتا نے جھاؤ ہی کے ایک نڈے سے اُسے کھینا شروع کیا۔ تختہ ڈمگنا ہوا پانی میں بہ چلا۔

مالتی نے دل سے اس خطرے کا خیال دور کرنے کے لئے پوچھا:۔

"تم ہمیشہ شہروں میں رہے، دیہاتی زندگی کے عادی کیسے ہو گئے؟ میں تو ایسا تختہ کبھی نہ بنا سکتی۔"

مہتا نے اسے چاہت بھری نگاہوں سے دیکھ کر کہا: "شاید یہ میرے پچھلے جنم کا سنا کار ہے۔ قدرت سے مس ہوتے ہی جیسے مجھ میں نئی زندگی سی آ جاتی ہے۔ رگ رگ میں جنبش ہونے لگتی ہے۔ ایک ایک جڑ یا، ایک ایک جانور جیسے مجھے خوشی کی دعوت دیتا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ جیسے بھولے ہوئے شکلوں کی یاد دلانا ہوا یہ خوشی مجھے اور کہیں نہیں ملتی۔ مالتی! موسیقی کے رلانے والے راگوں میں بھی نہیں، فلسفہ کی بلند پروازوں میں بھی نہیں، جیسے یہ سب میرے اپنے گے ہوں۔ قدرت کے نچو میں پڑ کر جیسے میں اپنر

آپ کو پا جاتا ہوں، جیسے پرند اپنے گھونسلے میں آجائے۔“  
 تختہ ڈنگنا، کبھی ترچھا، کبھی سیدھا، کبھی چکر کھاتا ہوا جلا جا رہا تھا۔  
 دفعتاً آتی نے آزدگی سے پوچھا: اور میں تمہاری زندگی میں کبھی نہیں  
 آتی؟“

مہتا نے اس کا ہاتھ پکڑ کر کہا: آتی ہو، بار بار آتی ہو، خوشبو کے  
 ایک جھوٹے کی طرح، تغور کے ایک عکس کی طرح، اور پھر غائب ہو جاتی ہو۔  
 دوڑتا ہوں کہ تمہیں ہاتھوں سے جکڑ لوں، مگر ہاتھ کھلے رہ جاتے ہیں اور  
 تم ہوا ہو جاتی ہو۔“

ماتئی نے مجنونانہ کہا: ”تم نے اس کا سبب بھی سوچا یا سمجھا جا ہا؟“  
 ”ہاں ماتئی بہت سوچا اور بار بار سوچا۔“

”تو کیا معلوم ہوا۔“

”یہی کہ میں جس بنیاد پر اپنی زندگی کا گھر کھڑا کرنا چاہتا ہوں وہ ناپائدار  
 ہے۔ یہ کوئی بڑا محل نہیں، بلکہ صرف ایک چھوٹی سی ایکٹیو کمیٹی ہے، مگر اس  
 کے لئے بھی تو کوئی مستقل بنیاد چاہیے۔“

ماتئی نے اپنا ہاتھ تھپڑا کر جیسے رد ٹھٹھٹے ہوئے کہا: ”یہ جھوٹا حلقہ ہے۔  
 ”یہ جھوٹا حلقہ ہے۔ تم نے مجھے ہمیشہ امتحانی نظریے دکھایا۔ کبھی کی نگاہوں  
 سے نہیں کیا تم اتنا بھی نہیں جانتے کہ عورت امتحان نہیں چاہتی، بلکہ محبت  
 چاہتی ہے۔ امتحان کے اوصاف کو عیوب اور خُص نقص بنانے والی چیز ہے۔  
 محبت اس کے برعکس کر دکھاتی ہے۔ میں نے تم سے محبت کی تو میں خیال  
 ہی نہیں کر سکتی کہ تم میں کوئی عیب ہے، مگر تم نے میرا امتحان لیا اور تم مجھے  
 متون، مشورہ اور نہ جانے کیا کیا سمجھ کر مجھ سے ہمیشہ دور بھاگتے رہے۔ نہیں“

میں جو کچھ کہنا چاہتی ہوں وہ مجھے کہہ لینے دو۔ میں کیوں متلون اور شوخ تھی؟ اسی لئے کہ مجھے وہ محبت نہیں ملی جو مجھے مستقل اور متین بناتی اگر تم نے اپنے آپ کو اسی طرح میرے لئے وقف کر دیا ہوتا جیسا میں نے تمہارے لئے کیا ہے تو تم آج مجھ پر ایسا نامتناہب حملہ نہ کرتے۔“

مہتا نے مالتی کے روٹھنے کا لطف اٹھاتے ہوئے کہا: تم نے میرا امتحان کبھی نہیں لیا؟ سچ کہتی ہو؟

”کبھی نہیں۔“

”تو تم نے غلطی کی۔“

”میں اس کی پروا نہیں کرتی۔“

”جذبے میں نہ آؤ، مالتی۔ محبت کرنے سے پہلے ہم سب امتحان لیتے ہیں اور تم نے بھی لیا، درپردہ ہی سہی۔ میں آج تم سے صاف کہتا ہوں کہ پہلو میں نے تمہیں اسی طرح دیکھا جیسے ہر روز ہزاروں عورتوں کو دیکھا کرتا ہوں۔ صرف تفریحی خیال سے اور اگر میں غلطی نہیں کرتا تو تم نے بھی مجھے اپنی تفریح کے لئے ایک نیا کھلونا سمجھا۔“

مالتی نے ٹوکا: غلط کہتے ہو۔ میں نے کبھی تم کو اس نظر سے نہیں دیکھا جس نے پہلے ہی دن تمہیں اپنا دیوتا بنا کر اپنے دل.....“

مہتا نے بات کاٹ کر کہا: پھر وہی جذبہ! مجھے ایسے اہم معاملے میں جذبے کو دل دینا پسند نہیں۔ اگر تم نے پہلے ہی دن سے مجھے اس عتاب کے قابل سمجھا تو اگلے ہی سبب ہو سکتا ہے کہ میں تمہیں بنانے میں تم سے زیادہ ہوشیار ہوں اور نہ جہاں تک میں نے نوانی فطرت پر غور کیا ہو، عورتیں محبت کے بارے میں کافی جہان بین کرتی ہیں۔ پہلے تو سوئٹزرلینڈ کے مردوں کی

آزمائش ہوتی تھی۔ وہی بات اب بھی موجود ہے، چاہے اس کا روپ کچھ بدل گیا ہو۔ میں نے تب سے برابر ہی کوشش کی کہ خود کو سراپا تمہارے سامنے رکھ دوں اور اس کے ساتھ ہی تمہارے دل تک پہنچ جاؤں اور میں جوں جوں تمہارے دل کی گہرائی میں گیا ہوں مجھے جو اہرات ہی ملے ہیں۔ میں تفریق حکے لئے آیا اور آج پرستار بنا ہوا ہوں۔ تم نے میرے اندر کیا پایا، یہ مجھے معلوم نہیں۔“

نئی کا دوسرا کنارہ آگیا۔ دونوں اتر کر اسی ریت کے فرش پر جا بیٹھے اور ہنستا پھر اس رو میں بولے۔ ”اور آج میں یہاں وہی پوچھنے کے لئے نہیں لایا ہوں۔“

ماتنی نے کاہنتی ہوئی آوازیں کہا۔ ”کیا ابھی تمہیں مجھ سے پوچھنے کی ضرورت باقی ہے۔“

”ہاں اس لئے کہ میں آج تمہیں اپنا وہ روپ دکھاؤں گا جو شاید ابھی تک تم نے نہیں دیکھا اور جسے میں نے بھی چھپا پایا ہے۔ اچھا مان لو کہ تم سے شادی کر کے کل بیوفائی کروں تو تم مجھے کیا سزا دو گی؟“

ماتنی نے ان کی طرف حیرت سے دیکھا۔ اس کا مطلب وہ نہ سمجھی تھی

”ایسا سوال کیوں کرتے ہو؟“

”میرے لئے یہ بہت اہم بات ہے۔“

”میں اسے ممکن نہیں سمجھتی۔“

دنیا میں کچھ بھی ناممکن نہیں ہے۔ بڑے سے بڑا مہاتما بھی ایک لمحے میں

بھڑٹ ہو سکتا ہے۔“

”میں اس کا سبب کھوجوں گی اور اسے دور کروں گی۔“

”مان لو کہ میری عادت نہ چھوٹے۔“

”پھر میں نہیں کہہ سکتی کہ کیا کروں گی۔ شاید ہر کھا کر سو رہوں“

مالتی نے ڈرتے ہوئے پوچھا: ”بناؤ؟“

مہتاب نے استقلال سے کہا: ”میں پہلے تمہاری جان لے لوں گا، پھر اپنی دسے دوں گا۔“

مالتی نے زور سے ہنستے مارا اور سر سے پیر تک کانپ اٹھی۔ اس کا ہنسنے کا لڑکش کے چھپانے ہی کے لئے تھا۔

”مہتاب نے پوچھا: تم نہیں کیوں؟“

”اسی لئے کہ تم ایسے ہنسنے والے نہیں معلوم ہوتے۔“

نہیں مالتی، اس بارے میں میں پورا حیوان ہوں اور اس پر لجانے کا کوئی سبب نہیں دیکھتا۔ روحانی محبت اور انیہار آمیز محبت اور بے غرضانہ محبت جس میں آدمی خود کو مٹا کر صرف معشوق کے لئے جیتا ہے، اس کی خوشی میں خوش ہوتا اور اس کے پیروں پر اپنی روح قربان کر دیتا ہے، یہ سب میرے لئے محض بے معنی الفاظ ہیں۔ میں نے کتابوں میں ایسی محبت کے قصے پڑھے ہیں۔ جہاں عاشق نے معشوق کے لئے عشاق کے لئے اپنی جان دے دی ہے۔ مگر اس جذبے کو میں حقیقت کہہ سکتا ہوں، اطاعت کہہ سکتا ہوں، مگر محبت کبھی نہیں۔ محبت سیدھی سادی گائے نہیں بلکہ خونخوار شیرنی ہے جو اپنی شکار پر کسی کی آنکھ بھی نہیں بڑھنے دیتی۔“

مالتی نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا: ”اگر محبت خونخوار شیرنی ہے تو میں اس سے دور ہی رہوں گی۔ میں نے تو اسے گائے ہی سمجھ رکھا تھا۔ میں محبت کو بدگمانی سے بالاتر سمجھتی ہوں۔ وہ جسمانی نہیں، بلکہ روحانی چیز ہے۔ بدگمانی کی وہاں ذرا بھی گنجائش نہیں، اور مہتاب تو بدگمانی ہی